ڈاکٹر سید عبداللہ

صائبؔ[1] ..... روشن دل شاعر

دورانِ مطالعہ، میرزا صائب اصفہانی (تبریزی) کے اشعار جب کبھی کبھی نظر سے گزرتے تھے تو اکثر ان میں ایک خاص مزا، ایک خاص مزاج محسوس ہوتا مگر میں یہ معین نہ کر پاتا کہ اس کی شاعری کے اس مزاجِ خاص کے عناصر کیا ہیں۔ اس معاملے میں پرانے تذکروں کی رہنمائی اکثر نامکمل ثابت ہوئی اور نئے تذکرے بھی کچھ زیادہ تشفی نہ کر سکے۔ البتہ شبلی کی شعر العجم نے لطف دیا مگر میرے سوال کا قطعی جواب وہاں بھی نہ ملا۔ شبلی اگرچہ فارسی شاعری کے مزاج داں ہیں، مگر انھوں نے شعر العجم میں صائبؔ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بیحد مجمل ہے۔ ان کا بیان ہے:

"میرزا صائب کا خاص انداز تمثیل ہے۔ تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا لیکن صائبؔ نے اس کثرت سے اس کو برتا کہ اس کی خاص چیز ہو گئی۔ اس کے علاوہ اور شعرا، عام مضامین میں تمثیل سے کام لیتے تھے۔ صائبؔ نے اخلاقی مضامین کے لیے خاص کر دیا۔"

اس بیان سے کچھ رہنمائی ملی لیکن دیوانِ صائبؔ کی بار بار ورق گردانی کرنے پر یہ محسوس ہوا کہ اس کے کلام میں تمثیل (مثالیہ) بلاشبہ موجود ہے مگر یہ اس کی خاص چیز نہیں۔ صائبؔ سے پہلے کے شعرا (نظیریؔ وغیرہ) اور صائبؔ کے معاصرین (کلیمؔ، علی قلی سلیمؔ اور غنیؔ وغیرہ) کے یہاں بھی (جیسا کہ شبلی نے خود لکھا ہے) اس کی کثرت ہے، لہٰذا یہ اس کی خاص چیز نہ ہوئی۔ اسی طرح یہ بھی ثابت نہ ہوا کہ صائبؔ نے تمثیل کو اخلاقی مضامین کے لیے خاص کر دیا۔ بلاشبہ صائبؔ کی شاعری کا بڑا حصہ اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے مگر یہ مضامین تمثیل کے پابند نہیں، بے تمثیل بھی ادا ہوئے ہیں۔

---

[1] حالاتِ زندگی کے لیے دیکھیے شبلی: شعر العجم حصہ سوم۔ براؤن تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم۔ قدیم تذکروں کے حوالے مذکورہ بالا دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔

اس کے بعد شبلی نے فرمایا:

"جابجا خیال بندی اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے، اور یہ خاص متاخرین کا انداز ہے، اگرچہ صائب کے ہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار نہیں پائے جاتے جو عرفی ونظیری کے ہاں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، تاہم زبان کی فصاحت، ترکیب کی بندش، محاورات کا استعمال ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ بخلاف اور متاخرین کے جن کے کلام کو پڑھ کر زبان کی خوبیوں کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہیں ہوتا۔ (شعر العجم۔ حصہ سوم)

شبلی کے اس تجربے سے مطالعہ کی راہیں کچھ کھلیں اور فکر و تحقیق کو نتائج تک پہنچنے میں آسانیاں بہم پہنچائیں۔ لیکن اجمال نے فہم کے راستے روک دیئے۔ اور قاری پھر بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ صائب کی انفرادی اور خاص الخاص امتیازی باتیں کیا ہیں؟

مندرجہ بالا بیان میں شبلی نے ہمیں بتایا کہ:-

(۱) صائب کے کلام میں خیال بندی اور مضمون آفرینی بھی ہے۔

(۲) اس میں عشق و محبت کے اسرار اور وہ لطیف خیالات نہیں پائے جاتے جو نظیری وغیرہ کے یہاں ہیں:-

(۳) زبان کی خوبیاں مثلاً عمدہ تراکیب وغیرہ موجود ہیں۔

بیشک صحیح ہے کہ مذکورہ خصوصیات صائب کے کلام میں ہیں مگر ان تک محدود نہیں، صائب کے معاصر بھی ان میں شامل ہیں، اور شبلی کی رہنمائی میں ان تک پہنچنا آسان بھی ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ سمجھنا باقی ہے کہ صائب کی انفرادی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی شاعری میں اس کی اپنی تصویر بھی موجود ہے یا نہیں؟ وہ جس دور کا شاعر ہے اس کے ذہنی وفکری نقوش بھی اس کی شاعری پر مرتسم ہیں یا نہیں؟ پھر کیا اس کے پیرایہ ہائے بیان میں اس کا اپنا عکس بھی ہے یا نہیں اور آخر میں یہ کہ وہ اپنے زمانے میں رہ کر اس میں نمایاں انفرادی مقام بھی حاصل کر سکا یا نہیں؟ یہ سب سوال نہایت مشکل ہیں اور ان کے جواب آسان نہیں۔ غور کیجئے دیوان کے سینکڑوں اوراق میں ہزاروں اشعار ہیں جو اپنی ظاہری یک رنگی اور یکسانی سے متوحش کیے دیتے ہیں۔ ان کے اندر سے کوئی خاص الخاص انفرادی نقش ڈھونڈھ نکالنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ صائب مذہبی مزاج کا آدمی تھا۔ اس لئے نوجوانی ہی میں حج کیا اور اس طرح اپنے سینے کو عقیدتوں سے روشن کیا۔ یہ نیاز مندی اس کے کلام میں موجود ہے۔ پھر تصوف کے دیئے ہوئے عقیدے لہجے اور رویے بھی ہیں جو دوسروں کے یہاں بھی ہیں مگر صائب نے انھیں باندازِ خاص بیان کیا ہے۔ وہی تجرد کی تلقین، وہی عزلت، وہی خاکساری، وہی وسعتِ مشرب، وہی صفائے قلب، وہی قناعت جو تصوف میں عام ہے، صائب کے کلام میں بھی ہے۔ اور اس کے ضمن بہت سے عمدہ اشعار ہیں جو انتخاب کے قابل ہیں۔

اس نے زندگی کا ایک حصہ ہندوستان اور کشمیر میں گزارا۔ مگر اصفہان کی یاد اس کے دل میں ہمیشہ خلش پیدا کرتی رہی۔ اداسی کی یہ چبھن نوکِ خار کے مانند اس کے کلام میں موجود ہے۔ مگر کشمیر کا حسن و جمال بھی اس کے دل پر نقش ہے جو اس کی تراکیب و الفاظ میں منعکس ہے۔

ظفر خان کی قدر دانی اسے نصیب ہوئی اس سے فارغ البالی کا احساس پیدا ہوا جو اس کے کلام میں موجود ہے۔ کلیم اور غنی اس کے ہم بزم اور دوست تھے۔ اُن کے لیے اس کے دل میں مہر و اُنس کے جذبات ہیں شفقت کی یہ لہر بھی اس کے اشعار میں ہے۔

ہندوستان سے اصفہان پہنچا تو شاہ عباس صفوی نے قدر دانی کی۔ یہاں بھی فراغت اور فارغ البالی میسر آئی۔ اس کی وجہ سے اس کے کلام میں ذاتی وجوہ سے بھی انبساط کی فضا پائی جاتی ہے اگرچہ بے ثباتی کا غم، اور بعض اوقات اہلئے زمانہ کے بارے میں شکایت بھی ہے جو بتقاضائے بشریت ہے۔ یہ قطعی ہے کہ صائب غم کا شاعر نہیں۔ اس کے کلام میں معمولی افسردگی ہو سکتی ہے اور کچھ دل شکستگی بھی ہے مگر غم کا گہرا تجربہ اس کے یہاں موجود نہیں۔ نہ محبت کا نہ ذاتی حوادث کا۔ وہ محبت کا شاعر بھی نہیں اور اگر معاملاتِ محبت سے اسے سروکار ہے تو سرسری ہے۔ ان معنوں میں وہ نظیری وغیرہ سے بالکل مختلف قسم کا آدمی ہے۔

صائب کے کلام پر مجموعی نظر ڈالنے سے اس کی تین ممتاز خصوصیات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

اول۔ یہ کہ وہ اپنے زمانے کے اخلاقی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔

دوم۔ یہ کہ اس کی شاعری میں اس کے زمانے کا تمدن جلوہ گر ہے۔

سوم۔ یہ کہ اس کی شاعری کا اسلوب اس تہذیب و تمدن کی آئینہ داری کرتا ہے، جس میں اس نے اپنی زندگی گزاری۔

یہ شاہجہان کا زمانہ ہے۔ یہ روشنیوں کی تہذیب ہے۔ اس میں تہذیبِ نفس کی معراج دل کی روشنی ہے۔ یہی روشن دلی صائبؔ کے کلام میں جا بجا نور بکھیر رہی ہے۔ اس کے لیے اس نے گاہ گاہ زندہ دلی اور صاف دلی کی ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں مگر روشن دلی، روشن ضمیری، روشن گہری ایک پختہ تصور یا گہرے تجربے کے طور پر صائبؔ کے کلام میں موجود ہے۔ (اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ روشن دلی کی ترکیب کلیمؔ اور شاید غنیؔ کے یہاں بھی ہے مگر صائبؔ کے یہاں اس کی تکرار بہت زیادہ ہے)۔ بہرحال یہ اس دور کا تجربہ خاص معلوم ہوتا ہے۔ اور صائبؔ اس کا نمائندہ خاص ہے۔

صائبؔ نے اپنے کلام میں "اشراقیاں" کی ترکیب بھی استعمال کی ہے اور "خطۂ یونان" کا استعارہ بھی ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ اس دور کی علمی اور فلسفیانہ صوفیانہ لہر کے زیرِ اثر ہوگا۔ یہ وہ دور ہے جس میں ایران اور ہندوستان میں علامہ فندرسکی، میر باقر داماد اور ملا صدرالدین شیرازی (ملا صدرا) کی حکمت، اشراق کے تصورات کو عام کر چکی تھی اور دونوں ملکوں کے مدارس میں اس حکمت کو قبول کیا جا چکا تھا اور زمانۂ قریب میں پیر روشن (روشان) اور فرقہ نوربخشی کے عقیدوں کا بھی خاصا چرچا رہا تھا۔ ان وجوہ سے یہ ممکن ہے کہ صائبؔ کے اس تصور کا سرچشمہ یہی حکمتِ اشراق ہو۔

صدرالدین شیرازی کی حکمت کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے مشائی فلسفے کو رواقی فکر کے ساتھ تطبیق دی پھر اسے تصوف و اخلاق سے اور آخر میں اصولِ دین سے پیوند دیا اور اس میں بوعلی سینا کے علاوہ شیخ الاشراق، شیخ شہاب الدین سہروردی (المقتول) سے بھی استفادہ کیا۔

نور کی رمز اشراقی حکمت (تصوف) میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی بنیاد پر زندگی اور کائنات کا سارا تصور اجلا گیا ہے۔ گویا روشنی زندگی کی ابتدا بھی ہے اور اس کی انتہا بھی[1] اور ظاہر ہے کہ اس کا سب سے بڑا مرکز و محور دل ہی ہو سکتا ہے۔ جسے ایک روشن دل مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔

---

[1] اس موضوع پر سید حسین نصر کی کتاب THE THREE SAGES ملاحظہ ہو۔ نیز ایم ایم شریف کی HISTORY OF MUSLIM PHILOSOPHY اور STACE کی کتاب HISTORY OF GREEK THOUGHT (بذیل NEO-PLATONISM) بھی دیکھیے

بہرحال قلب میں نور اور روشنی کا پیدا ہونا یا پیدا کرنا صائب کا بھی خاص تصور ہے اور یہ اس کی خاص تہذیب بھی ہے۔ میں اسے تہذیب اس لیے کہتا ہوں کہ یہ اس کی نظر میں محض بصیرت و عرفان نہیں بلکہ ایک کردار اور ایک عمل بھی ہے جس کا تعلق اندرونی آگاہی سے ہے مگر ظاہری اسلوب حیات سے بھی ہے۔

صائب کے کلام میں اس ترکیب سے بہت سے مفہوم وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اشیا کی حقیقت صرف روشن دلی سے معلوم ہو سکتی ہے:

بہ روشنائیِ دل می توان جہان را دید
وگرنہ سہل بود دیدن و ندیدن چشم

جب دل روشن ہو جاتا ہے تو علوم رسمی کی ضرورت نہیں رہتی:

ہیچ نقشے نیست کز آئینہ رو پنہان کند
دل چو روشن شد کتاب و دفترے درکار نیست

دلِ روشن، علم و کمال کا دعویٰ نہیں کرتا۔ (کیونکہ بقول خواجہ فریدالدین عطار، حقیقی علم "عیان است نہ کہ بیان"):

دلِ روشن نکند دعویِ دانش صائب
عرض جوہر ندہد آئینہ چون رخشان است

روشن دلی، نورِ خدائی سے پیدا ہوتی ہے:

ہر سرائے را چراغے ہست صائب در جہان
خانۂ دل روشن از نورِ خدائی می شود

دل کی روشنی سوختہ جانی سے پیدا ہوتی ہے:

مطلب از دگران روشنیِ دل صائب
کہ دلت را سخنِ سوختہ پرداز آمد

لہ میں نے دیوان صائب کی چند ردیفوں سے ان اشعار کا انتخاب کیا ہے جن میں روشن دلی کی ترکیب آتی ہے۔

روشن دلی عبادت سے میسر آتی ہے:

دلِ روشن بتو چون شمع ازاں بخشیدند
کہ شبے زندہ بمحراب توانی گزراند
خانۂ دل روشن از نورِ عبادت می شود

صائبؔ کے تصور کی روشن دلی ایک خاص ریاضت کی طلب گار ہے۔ اس کے لیے ناتوانوں اور عاجزوں سے محبت پیدا کرنی ضروری ہے:

دوستی با ناتوانان مایۂ روشن دلی است
موم چون بار شتہ سازد شمعِ محفل می شود

اس میں توحیدِ خالص کا یقین ناگزیر ہے:

مشو ز وحدت و کثرت دو بین کہ یک نور است
کہ آفتاب شود روز، و شب ستارہ شود

افتادگی و خاکساری اس کی خاص تہذیب ہے:

از عجز چو شبنم نفتادیم درین راہ
افتادگیٔ ما گل روشن گہری بود

روشن دل لوگ کبھی پریشان و مضطرب نہیں ہوتے:

ز خشک سال نگردد دہان گوہر خشک
فلک بمردم روشن گہر چہ خواہد کرد

دلِ روشن از انقلاب است ایمن
ز طوفان خطر آب گوہر ندارد

صاف دلی اس راستے کی شرطِ اوّل ہے:

صیقلِ روح است فیضِ صحبتِ اشراقیاں
سینۂ خود را مصفا ساز از یونانِ صبح

دل بدشمن چون ملائم شد مصفا می شود

صدق روشن گر ضمیر من است

پیشِ روشن گہران صحبتِ ناجنس بلاست

دلِ روشن نہ چراغے است کہ خاموش کنند

برمن از روشن دلی وضعِ جہان ہموار شد

خار در پیراہن آتش گلِ بے خار شد

در دلِ روشن نباشد پیچ و تاب

از جلا آئینہ بے جوہر شود

پہلو تہی نمودنِ روشن دلان زخلق

بر روئے زنگیان در آئینہ بستن است

روشن شود از ریختنِ اشک دلِ ما

صحبت روشن ضمیران کیمیائے دولت است

سرکش تامی توانی از خط فرمان صبح

صحبتِ روشن دلاں چشمہ اراجاں کند

کوہ را برقِ تجلی آتشِ جولاں کند

ان اشعار سے روشن دلی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ حال بھی ہے اور آگاہی بھی ۔ فکر بھی ہے اور کردار و تہذیب بھی ۔ قدیم دور میں اسلامی عقیدوں کے تحت جو اخلاقی شخصیت پیدا ہوتی تھی اس کی تعمیر میں مذہب حکمت، تصوف اور اخلاق یکساں حصہ لیتے نظر آتے ہیں ۔ یہ دنیا بیزاری نہ تھی بلکہ قبیح دنیاداری سے اجتناب کا سبق تھا ۔ یہ اس دنیاداری سے دوری تھی جو اچھے جذبات کی قاتل اور اعلیٰ اقدار و عقائد کی دشمن تھی ۔ ایک پاکیزہ زندگی، ایک پسندیدہ خلق، ایک عمدہ ضابطۂ شرافت اور دستورِ آداب ۔ شاہجہان کے دور میں یہ آداب ایک فن، ایک تہذیب بن چکے تھے اور صائب اسی کی نمائندگی کرتا ہے ۔

صائب نے اپنی مسلسل غزلوں میں ان مثالی روشن دلوں کے اوصاف کی تفصیل بھی دی ہے ۔ ایک غزل کا مطلع درج ذیل ہے:

خوش وقت گروہے کہ ہمہ اندیشہ یار اند　　چون کعبہ روان روی بدیوار ندارند

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روشن دلی کا خارجی ظہور ہمواری اور پاکیزگیٔ قلب (یعنی کدورتوں سے پاک دل) میں ہوتا ہے۔

صائب کی ردیفوں کا مطالعہ بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ مثلاً چند ردیفیں اس کی تائید کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں۔ یکرنگی اور ہمواری کے مضمون کے لیے دیکھیے:

ازان مرا شب و روز سیاہ ہر دو یکے است

کہ با غرور تو آہ و نگاہ ہر دو یکے است

بس است پیرہن تن محیط وحدت را

کہ پیش سیل فنا کوہ و کاہ ہر دو یکے است

اس ساری غزل میں "ہر دو یکے است" کی تکرار، صائب کی یکرنگی و ہمواری کا اظہار کرتی ہے۔

ایک اور غزل کی ردیف ہے "یکے است"۔ اس کا مطلع ملاحظہ ہو:

از بہارستان یک رنگی شراب و خون یکے است

بلبل و گل سرو و قمری، لیلی و مجنوں یکے است

"یکے است" ردیف کی ایک اور غزل غم ناک، فتراک قافیے کے ساتھ ہے۔ مقطع ہے:

سر بر آوردہ ام از قلزم وحدت صائب

سرمہ در دیدہ انصاف من و خاک یکے است

ایک اور غزل ہے: موج شراب و موجۂ آب بقا یکے است۔ ایک اور غزل کی ردیف ہے: برابر است (مصرع ہے: ریگ روان و آبلۂ پا برابر است)۔ اسی ردیف میں ایک اور غزل ہے:

پیش کسے کہ درد بدرمان برابر است

ایک اور مطلع ملاحظہ ہو:

شہد در کوزہ و در روزن زنبور یکے است

شمع ہر چند کہ بسیار بود نور یکے است

در غم و شادی ایام مرا حال یکے است

فصل ہر چند کند جامہ بدل سال یکے است

اسی طرح اطمینانِ قلب[1] صاف دلی، بے نیازی، کشادہ روئی اور صفائے دل کا مضمون ہے کہ اپنی کثرت کی بنا پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ صائب کا مزاج خاص ہے۔

---

[1] خورسند با ہزار تمنا نشستہ ایم
باصد ہزار درد تسلی نشستہ ایم
باخاص وعام یک رنگ از مشرب رسائیم
باخار و گل سمن ریز چون نور آفتابیم
آنجا کہ داغ بیدردگل گرد پنبہ زائیم
آنجا کہ زخم عشاق خندید مشک نابیم

صائب کو زندگی میں فارغ البالی نصیب ہوئی۔ اس کا اثر اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے فکرا آدمی ہے۔ اس کے یہاں ایک تہذیب، ایک سنجیدگی ہے۔ ایک غزل میں لکھتا ہے۔

ما خندہ را بہ مردم بے غم گزاشتیم — گل را بشوخ چشمی شبنم گزاشتیم
قانع بہ تلخ وشور شدیم از جہان خاک — چون کعبہ دل بہ چشمۂ زمزم گزاشتیم
مردم بیادگار اثرہا گزاشتند — ما دست را بسینۂ عالم گزاشتیم
الماس بے نمک شدہ بود از موافقت — تدبیر زخم وداغ بہ مرہم گزاشتیم
صائب فضائے چرخ مقام نشاط نیست — بیہودہ پا بہ مجلسِ ماتم گزاشتیم

یہ مہذب سنجیدگی ایک لطیف سی افسردگی کو جنم دیتی ہے لیکن گہرا غم نہیں۔ اور محبت کے مضامین میں بھی غم نہیں۔ (اور وہ ہیں بھی کم)۔ داغ و درد کا تصور ہے تصویر نہیں۔ ذاتی تجربہ معلوم نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل غزل میں داغ و درد کی کچھ خلش ہے اور چبھن بھی ہے مگر ردیف اور صیغہ خطاب نے بتایا کہ یہ بھی تجربہ نہیں۔

آتش بجزمن از گل باغے ندیدہ
جوشِ جنون ز صدمہ دلغے ندیدہ
پروانہ وار سیلیے آتش نخوردہ
در دود مان آہ چراغے ندیدہ

(سلسلہ اگلے صفحہ پر)

صائب کے کلام میں روشنی کا تصور اتنا فراوان ہے کہ نور اور روشنی کا لفظ دوسری ترکیبوں کے ساتھ بھی بکثرت آتا ہے روشن گر، عالم روشن، بادہ روشن، دیدہ روشن، روشن گہر، آئینہ روشن، خورشید روشن، روشن ضمیر، جانِ روشن وغیرہ۔ روشن است بمعنی ظاہر است بھی بکثرت ہے۔

نور اور ضیاء۔۔۔ جلا، تجلی، صیقل، جوہر جلوہ، آتش آفتاب، خورشید، ستارہ، انجم، صبح، ماہتاب اور اس کے مقابلے کے الفاظ ظلمت زنگار شب وغیرہ بھی جابجا ہیں۔

"اشراقیاں" کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے لیکن بعض اور قریب المعنی مترادفات بھی ہیں مثلاً صاف دلان (ع: قرین صاف دلان شو کہ بے ضیا نشود) پاکیزہ دلان، پاک گوہران، نیک دلان، شیشہ دلان، سبک روحان، صافی مشربان، روحانیان اور ان کے مقابلے کے الفاظ کور باطنان، تیرہ درونان، تیرہ روان بے سعادتان، افسردہ طبعان، مردہ دلان، سرد مہران وغیرہ وغیرہ۔

(بقیہ حاشیہ)

با نالہ یک سراسر گلشن نرفتہ ام

با عندلیب گوشۂ باغے ندیدہ ام

از لالہ زار آبلہ یک گل نچیدہ ام

در پائے شوق خار سراغے ندیدہ ام

با چاک سینہ دست و گریبان نبودہ ام

در دست خود زداغ ایاغے ندیدہ ام

عمرے چو گل بخندۂ شادی گزشتہ است

زخمے نیاز مودہ و داغے ندیدہ ام

صائب ز رگ ہمین اندیشہ ات زکیست

ہرگز ز عمر خویش فراغے ندیدہ ام

اب ظاہر میں درد و داغ کے سلسلے پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں مگر گہرائی کہیں نہیں۔

اس زمانے میں تصوف ایک تہذیب ایک اسلوب حیات تھا۔ اس میں دل شکستگی کی کچھ صورتیں ریاضت سے پیدا کی جاتی تھیں۔ یہ دل شکستگی صائب کے کلام میں بھی ہے مگر یہ دل شکستگی بھی راحت کا ایک انداز ہے۔

ان سب کی تائید میں وہ سب غزلیات بھی ہیں جن کی ردیف صبح اور آفتاب ہے۔

یہ جملہ کوائف صائب کے تصورِ روشن دلی اور تہذیبِ روشن دلی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ شاعر کا ذہنی تعلق نور اور روشنی سے اتفاقی اور سرسری نہیں بلکہ اس کا ایک پختہ مزاج اور ذوقی و روحانی تجربہ ہے۔

روشن دلی (EN LIGHTEN MENT) کا یہ نمائندہ شاعر بڑی حد تک میتھیو آرنلڈ کے مہذب انسان کے مانند سیرینی و حلاوت اور لطافت و نفاست کا بھی شاعر ہے۔ اس کے یہاں وہ تہذیب بھی ہے جو شریف انسانوں کی تہذیب ہے اور نور و رنگ اور جمال و کمال سے معمور ایک تمدن بھی جلوہ گر ہے جس کا عروج ہم دورِ شاہجہانی میں دیکھتے ہیں۔ یہ لال قلعہ اور تاج محل کا دور ہے۔ یہ مغلوں کی باغ آرائی کا عہدِ شباب ہے۔ یہ سرو و صنوبر۔ آبِ رواں۔ اور چشمہ ہائے صافی کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب روشن دلی اور پرتو مہتاب دونوں کا ایک مہذب انسان کی زندگی میں جمع ہو جانا ممکن تھا۔

صائب نے آگرہ اور کشمیر کو دیکھا ہی نہیں ان میں زندگی کا لطف بھی اٹھایا ہے۔ اور ایک تہذیب کی پروردہ داریوں کے اندر ان سب مظاہر و مناظر کے نقش اپنے ذوق و ذہن میں مرتسم کیے ہیں۔

اس لیے یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ صائب کے کلام میں حسین اور چمکدار اور دلکش اشیا کے نقش کیوں جمے ہوئے ہیں۔ دیوان پر سرسری نظر ڈال لیجیے ہر ہر صفحے پر جا بجا گوہر، صدف، چراغ، روشنی، فانوس، مشک، عنبر، شمع، فروغ، جلوہ، اطلس، در، تصویر، آئینہ، سنجاب، سمور، قبائے جدید، جلوۂ مہتاب، شبِ مہتاب، صندل، حنا، سرمہ، پرتوِ خورشید، سیماب، ابرِ نیسان، شیشہ، شیشہ باز، رنگین لباسی شمع جیسے دلکش الفاظ ملیں گے:

طوطی چو محو گشت دو عالم دو عینک است
طوطی جو مست شد در و دیوار آئینہ است

اس کے علاوہ قندیل، برق، رنگ مینا، شمع کافوری، شمع عالم افروز اور صدف و گوہر کی تو وہ کثرت ہے کہ عہدِ شاہجہانی کی ساری ثروت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ بیان ہے کہ روشن دلی کے علاوہ لفظ گوہر بھی صائب کا استعارۂ خاص ہے۔ جس کے اردگرد صدہا مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس علامت کے علاوہ سیلاب کے لفظ سے بھی طرح طرح کے تصورات و مضامین وابستہ ہیں اور یہ بھی صائب کی محبوب علامتوں میں سے ہے۔ یوں موج و بحر، چشمہ و دریا

سے بھی دل چسپی ظاہر ہوتی ہے مگر یہ علامتیں صائبؔ سے مخصوص نہیں۔ اکثر صوفی شاعروں کے کلام میں موجود ہیں۔

شبلی نے تمثیل اور اخلاقی مضامین کو صائبؔ کی خصوصیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور یہ درست بھی ہے۔ لیکن کہنے کی بات یہ ہے کہ صائبؔ کے کلام کی دلکشی کا ایک بڑا سبب اس کے شیریں اور چرب الفاظ اور خوشنما ترکیبیں ہیں جن سے شعر ایک خوش لباس پیکر بن جاتا ہے۔

یہ الفاظ اور یہ ترکیبیں اس کے مزاج اور اس کے تمدن کی نقاش ہیں۔

اس کے الفاظ (جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے) شاہجہانی عہد کی پر تکلف زندگی سے متعلق ہیں جن سے استعارات وکنایات پیدا کیے گئے ہیں۔ کچھ خوش نما پرندے طوطی، طاؤس، ہدہد اور قمری وغیرہ ہیں۔ کچھ باغ وچمن سے متعلق ہیں اور سایہ سرو اور آبِ رواں اور نو بہار وغیرہ پر مبنی ہیں اور یہ دراصل کشمیر وغیرہ کے ماحول کا اثر بھی ہے جس سے صائبؔ کے کلام میں رنگینی آگئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اپنے کلام کو پختہ و رنگین کہا ہے:

تلمۂ صائبؔ کلام پختہ و رنگین شدہ است
درحریم سینۂ خود سالہا جوشیدہ ام

جب رنگین الفاظ ایک لطیف ترتیب میں پیوست ہو کر ترکیب پاتے ہیں تو کلام میں لطفِ خاص پیدا ہو جاتا ہے۔ مضامین عام بھی ہوں تو بھی شعر بے حد دلکش بن جاتا ہے۔

صائبؔ نے اضافتوں کی مدد سے غیر معمولی حسن اور لطف پیدا کیا ہے۔ اور ترکیب کی بہار نظر آتی ہے۔ مگر صائبؔ کو بیدلؔ اور غالبؔ کی طرح کا ترکیب ساز نہیں کہا جا سکتا۔ صائبؔ نئے معانی اور نئے تجربات کا شاعر نہیں اسی لیے اس کے کلام میں ترکیب بطور خاص وسیلۂ تخلیق نہیں بنتی۔ البتہ فضا اور معانی کی خوش لباسی بڑی حد تک انھیں تراکیب کی بدولت ہے۔

صائبؔ کے فن میں پردہ داری اور ایمائیت موجود نہیں۔ اگرچہ صائبؔ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہنر پردہ داری (ایما و رمز) کا متقاضی ہے:

ہنر آنست کہ در پردہ نمایاں باشد
جوہر از آئینہ بیروں چو فتد زنگار است

ایک شاعر جسے تمثیل بندی کی عادت ہو وہ پردہ داری کر بھی نہیں سکتا۔ مثالیہ کا فن یہی تو ہے کہ شاعر

پہلے ایک اخلاقی حقیقت کا دعویٰ کرتا ہے پھر اس کی تائید میں مشاہدات زندگی میں سے کوئی واقعہ یا صورت حال یا کیفیت براہ راست بیان کر دیتا ہے۔ دعویٰ بھی واضح اور جواب (یا تائید) دعویٰ بھی واضح۔ اس میں پردہ داری کی گنجائش کم ہے۔

میری نظر میں یہ عیب نہیں۔ پروفیسر براؤن نے صحیح لکھا ہے کہ ایرانی نقاد صائب کے کلام کو بے مزہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں استعارے کی پیچیدگی یا مبالغے کے زور سے مضمون آفرینی موجود نہیں (مگر پروفیسر براؤن نے ایرانیوں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا)۔ صائب براہ راست بات کہنے والا شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام ہر سلیم المزاج قاری کی سمجھ میں آجاتا ہے اور پھر سادہ سی اخلاقی باتیں ہر شخص کے لیے مفید بھی ہوتی ہیں۔ ان میں دانش بڑے خوش نما لباس میں پیش کی گئی ہے، شاعر کی باتیں سچی بھی ہوتی ہیں اور میٹھی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ صائب ہندوستان میں علی العموم مقبول ہوا اور اس کے کلام کو آج تک مجموعۂ دانش سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صائب کے کلام میں بیان کی شوخی اور استعارے کا لطف نہیں — استعارہ ہے اور عمدہ و بامزہ ہے مگر بعید الفہم نہیں۔ قریب الفہم ہے یا عام طور سے متداول ہے۔ مثلاً:

لعلت بخندہ پردہ گل دریدہ است
آئینہ از رخت گل خورشید چیدہ است
سیماب شوق کشتہ نگردد بہ ہیچ تیغ
آتش کباب کردۂ یاقوت آن لب است

لیکن اس قسم کے استعارے بھی آجاتے ہیں:

خندۂ غنچہ پیکان زلب سوفار است

مگر یہ پیچیدہ نہیں اور سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس شاعر کا مقصد اپنے قارئین کو کچھ دینا ہوتا ہے اسے پیچیدہ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آخر ایسے فن سے فائدہ کیا ہے جس کے باعث کسی کے پلے کچھ نہ پڑے۔

ظاہر ہے کہ اس مزاج اور اس نصب العین کے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کلام کے لباس کی خوش نمائی کے علاوہ یہ بھی دیکھے کہ اس لباس کے اندر بھی کچھ ہے یا نہیں۔ اس خوش ترکیب شاعر کے بارے میں یہ تسلی ہے کہ اس کی ظاہری خوش نمائی کے اندر بھی بہت کچھ ہے۔ دانش بھی ہے اور انبساط بھی، روشن دلی بھی اور کشادگی و صفائے قلب بھی۔ اس کے علاوہ ایک آسودہ لہجہ اور فرحت بخش ترنم بھی ہے۔ کشادہ دلی

کا شاعر اپنی لے کی خوش آوازی اور ملائمت پر خاص نظر رکھتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ نظیری اور فیضی کے یہاں شورِ جرس، خروش و غوغا، کشتن اور زدن بہت ہے۔ مگر صائب مصاف کا آدمی نہیں۔ وہ خود کہتا ہے:

ہر دِ مصاف در ہمہ جا یافت می شود
در ہیچ عرصہ مردِ تحمل ندیدہ ام

صائب نے ردیفوں کے تنوع اور لطف سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ غور و تامل سے پڑھنے والے کو فوراً نظر آجائے گا کہ ردیف نے معنی افزائی میں بڑا حصہ لیا ہے۔

غور فرمائیے۔ ان کی ردیفیں ہر دو یکے است، اور بابا ست، آئینہ است، صبح، نیز ردیف ریختن گستن، می توان کردن، می باید شدن ــــ کہ چہ؟ ــــ اسی طرح اخلاقی امر و نہی کی نشان دہی کرنے والی ردیفیں، بکن، بہ بین، وغیرہ ــــ اور سوالیہ ردیفیں ندیدہ ای؟ وغیرہ سب ان کے معانی خاص سے ہم آہنگ ہیں مگر ردیفوں کا مطالعہ تفصیل و فرصت کا طلب گار ہے۔

صائب ایک مخلص شاعر تھا۔ اس کے انکسار و خلوص کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ اس نے متقدمین و متاخرین و معاصرین میں سے بہت سے شعرا کا بے تکلف اعتراف کیا ہے، یہ اس کی محبت اور صفائی قلب کے علاوہ اس کی فن شناسی کا بھی ثبوت ہے۔

یوں تو اس کے کلام میں خسرو، نظیری اور اوحدی وغیرہ کا تتبع بھی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے حافظ اور رومی سے گہری عقیدت ہے۔ اس نے (میرے اندازے کے مطابق) رومی کی غزلیات کے کامیاب جواب لکھے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ شاہجہان کا دور، حافظ اور رومی دونوں سے پچھی کا دور ہے مگر رومی سے طبائع زیادہ مانوس ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں عاقل خان رازی، شکر اللہ خاکسار اور بے شمار اور اہل ذوق مطالعہ رومی کی راہیں کشادہ کر رہے ہیں (ملاحظہ ہو میرا مضمون "مطالعہ رومی کی تحریک" میری کتاب مقاماتِ اقبال میں)۔

ظاہر ہے کہ ایسے دور میں جس نے اشراقی ذہن کے ساتھ حکمت کو بھی جذبہ بنا دینے کی کوشش کی، صائب کا رومی سے جذباتی طور سے وابستہ ہونا قرینِ قیاس ہے۔

صائب کے فن اور اس کے شخصیت ساز کلام کا آنے والے شاعروں پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے

کلام کے انتخاب تیار ہوئے ۔۔۔ اور بہت سے شاعروں نے جن میں بیدل اور غالب بھی شامل ہیں، اس کے فن سے اپنے اپنے طرزوں کی تکمیل میں حصّہ لیا۔

شبلی نے لکھا ہے کہ صائب فارسی کا آخری بڑا شاعر تھا۔ یہ صحیح ہے اگرچہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ شبلی کے بعد غالب پر جو بے اندازہ تحقیق ہوئی اس کی بنا پر خاتم الشعرائی کا اعزاز غالب کو کیوں نہ ملے۔ تاہم اگر غالب کی عظمت میں کچھ حصّہ صائب کے فیض کا بھی نکل آئے تو صائب کو آخری بڑا شاعر کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔

بہرحال اس موضوع پر اس مقالے میں اس سے زیادہ کچھ لکھنا مشکل ہے میں نے اس کی روشن دلی کے حوالے سے بات کی ہے، اس کے لیے شاید اتنا ہی کافی ہے۔

سیّد امیر علی

از شاہد حسین رزاقی

سید امیر علی اپنے عہد کی عظیم شخصیت تھے۔ اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ کے کارفرماؤں میں ان کا ایک بلند مقام ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، وہ سیاست دان بھی تھے اور ایک روشن خیال مفکر بھی۔ اور مصنف کی حیثیت سے تو ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ قانونِ اسلامی میں بھی ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ مسلمانانِ پاک و ہند کے قومی حقوق کے لیے گزشتہ صدی کے اواخر میں جب آئینی جدوجہد شروع ہوئی تو اس میں وہ پیش پیش تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مسلمان ملکوں کے دفاع اور خلافتِ عثمانیہ کو مغربی یلغار سے بچانے میں بھی آپ برابر کوشاں رہے۔

اس کتاب میں سید امیر علی کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو شرح و بسط سے پیش کیا گیا ہے۔

صفحات : ۳۰۹ قیمت : ۸/- روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور